جناب توقیر سلیم

بالِ جبریل کا ایک شعر

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

مندرجہ بالا شعر "بالِ جبریل" کا ہے۔ علامہ اقبال کی یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت تک اقبال لندن اور دوسرے یورپی ملکوں کو دیکھ چکے تھے۔ سب سے پہلے وہ ۱۹۰۵ء میں حصولِ تعلیم کے لیے ہندوستان سے باہر گئے اور ۱۹۰۸ء میں واپس آئے، جب وہ یورپ سے واپس آئے تو بار ایٹ لا اور ڈاکٹر تھے، گویا مغربی حکمت و دانش اور فکر و فلسفہ کا گہرا مطالعہ کر کے لوٹے تھے۔ آخری بار ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ مل کر ہندی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لیے شب و روز کام کیا۔ گویا مندرجہ بالا شعر امر واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ شعر اقبال کی حقیقت نگاری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ علامہ اقبال نے یہ شعر ۱۹۲۳ء میں افغانستان کے ایک دورے کے دوران کہا۔ یہ ان کی ایک طویل نظم کا شعر ہے۔ اس نظم کو علامہ اقبال نے "افکارِ پریشاں" کا نام دیا، اور یہ نظم حکیم سنائی غزنوی کے مزار کی زیارت کی یاد میں نوکِ قلم پر آئی۔ حکیم سنائی غزنوی شاعر بھی تھے، چنانچہ یہ نظم حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی میں سپردِ قلم کی گئی۔ اس شعر سے پہلے جو اشعار آتے ہیں، ان میں سے دو شعر خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اگر اس شعر کو ان دو اشعار کے سیاق میں پڑھا جائے تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب ایک حکیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی — اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

زیرِ بحث شعر کے مصرعِ اولیٰ میں دعویٰ کیا گیا ہے اور مصرعِ ثانی میں دلیل دی گئی ہے۔ لغوی مفہوم یہ ہے کہ مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ اس لیے اندھا نہ کر سکا کہ میری آنکھوں میں مدینہ و نجف کی

دھول نے سرمے کا کام کیا۔ مرادی مفہوم یہ ہے کہ میری تربیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہوئی تھی، اس لیے فرنگی تہذیب کی چکا چوند میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اگر میری ذہنی و اخلاقی تربیت اسوۂ حسنہ کی مرہونِ منت نہ ہوتی تو ممکن تھا اہلِ فرنگ کی پیش کردہ تہذیب اور دانش کے سامنے میں اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتا اور مغربی طرزِ حیات کے سامنے ہتھیار ڈال کر بے بس ہو جاتا۔ یہ سب کچھ اس لیے نہ ہوا کہ میں مسلمان تھا اور میرا خمیر عشقِ رسول سے اٹھا تھا۔ یہ شعر کلامِ اقبال میں دعوے اور دلیل کی بھی ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔ اس شعر کی تیسری خوبی وہ تیقن ہے جو اس شعر کی ادائیگی اور اظہار میں ملتا ہے۔ اس شعر کی چوتھی اور آخری خوبی اس کا مجاہدانہ اور مجادلانہ انداز ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال نے معرکۂ حق و باطل میں اہلِ حق کی طرف سے اہلِ باطل کو للکارا ہے اور انھیں حق و باطل کی پیکار میں اہلِ حق کی کُلّی فتح کا بھرپور یقین ہے۔ ان چار خوبیوں کی بدولت اقبال کا یہ شعر اقبال شناسی اور اقبال فہمی میں بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں اس شعر کی بنیادی اہمیت کیا ہے۔ آیئے اس پر غور کریں۔

سیاسی پس منظر

اگر اس شعر کو وقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ شعر جس زمانے (۱۹۳۳ء) میں کہا گیا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کس مپرسی، زبوں حالی اور آشفتہ سری کا زمانہ تھا۔ پاکستان کے حصول کی جدوجہد ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب بالِ جبریل چھپ کر آئی اس وقت تک مسلم لیگ کی سیاسی زندگی کا دورِ جدید بھی شروع نہ ہوا تھا۔ محمد علی جناح نے جو اس وقت قائدِ اعظم نہ بنے تھے، صوبوں میں رابطۂ عوام کی مہم شروع نہ کی تھی اور نہ مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کا کام شروع ہوا تھا۔ پاکستان کے حصول کا مطالبہ جو ۱۹۴۰ء میں ایک قرار داد کے ذریعے لاہور میں کیا گیا، ابھی پانچ سال دور تھا۔ انگریز اقتدار کی کرسی پر پوری طرح قابض تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں چار سال باقی تھے اور انگریزوں کو نہ جرمنی سے ڈر تھا اور نہ جاپان سے خوف۔ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے اقتدار اور ہندوستان کی اکثریت کے سامنے بے بس تھے۔ ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ ابھی رُوبہ عمل نہ آیا تھا اور ہندوستان میں جمہوریت کی بنیاد استوار نہ ہو سکی تھی۔ فرنگی حکمران کی مرضی پر سیاست و انتظامیہ کا انحصار تھا۔ ہندی مسلمان اقتصادی طور پر پس ماندہ تھے۔ مسلمان

روایت پرستی کا شکار اور جاگیرداری اور زمین داری کا زخم خوردہ تھا۔ مسلمانوں میں ایک اونچا خطاب یافتہ طبقہ پیدا ہوا تھا، جو اسلاف کے کارناموں کو فراموش کر چکا تھا اور انگریز کی غلامی پر نازاں تھا اور اس کی خوشامد میں فخر محسوس کرتا تھا۔ عمومی طور پر بھی یہ انگریز کی تقلید اور غلامی کا زمانہ تھا۔ تقلیدِ فرنگی طرزِ حیات کی اور طرزِ فکر کی اور غلامی انگریزوں کی سیاست اور سیادت کی۔ یہ ایک نہایت تاریک اور کربناک دور تھا۔ اس عہد کی انتہا تاریکی، بے پناہ کرب اور افق تا افق اشوب کو اقبال نے اپنی روح کے اندر انگارے کی طرح محسوس کیا اور ہندی مسلمانوں کو فرنگی طرزِ حیات اور طرزِ فکر کی خامیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کیا۔ مسلم جوانوں کو تو اقبال نے خصوصی طور پر خطاب کیا، کیونکہ یہی وہ طبقہ تھا جس میں ایک تو اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ تھی اور دوسرے مستقبل کی امیدوں کا مرکز و محور بھی جوانوں کا یہی طبقہ تھا۔ علامہ کی دور بین نگاہ نوجوان طبقے کو تحریک حصولِ پاکستان کے ہراول دستے کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال شاہین بچوں کے لیے آہِ سحر اور بال و پر کی دعا بارگاہِ ایزدی میں مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہماری ملّی تاریخ کے اس دور میں ہندی مسلمان میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا تھا اور دنیا کی آسودگی بھی چھن چکی تھی کہ علامہ نے سرورِ کائنات تک یہ پیغام بھجوایا:

اے بادِ صبا! کملی والے سے کہو پیغام مرا — قبضے سے امت بیچاری کے دین بھی گیا دنیا بھی گئی

مغربی تعلیم

اُمت کی یہ بے چارگی فرنگی اقتدار اور مغربی افکار کے باعث پیدا ہوئی۔ ۱۸۳۵ء میں مغل فرماں روا کا سکّہ انگریزوں کے حکم سے بند ہوا۔ ۱۹۳۵ء تک ایک سو سال کے فرنگی اقتدار میں ہندی مسلمان فرنگی اقتدار اور ہندو اکثریت کے دو پاٹوں میں پس کر اپنا قومی تشخص کھو چکے تھے۔ چند خیر خواہانِ ملت نے فرنگی تعلیم و تدریس اور فرنگی دانش و خرد میں نجات کی راہ دیکھی لیکن یہ راہ مسلمانوں کے لیے تاریک راہ ثابت ہوئی، کیونکہ فرنگیوں کے نظامِ تعلیم نے مسلمانوں کو مذہب سے لاتعلق کر دیا اور یوں ان کے اسلامی عقاید پاش پاش ہو گئے۔

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی — اس دور میں ہے شیشۂ عقاید کا پاش پاش

افکار و تصورات کی یہ رزم آرائی کلاسیکل انداز میں سامنے آئی۔ کفر و باطل کی طاقتیں ایک بار پھر حق و صداقت کے سامنے صف آرا ہو گئیں۔ اسلام کے خلاف یورپ کی یہ جنگ ہر کہیں لڑی جا

رہی تھی، لیکن ہندوستان میں یہ جنگ زیادہ شدید تھی۔ اقبال ایک دور اندیش سالار کی حیثیت سے صفِ اوّل میں تھے اور ہندی مسلمانوں کو فنیم کے پینتروں اور تدبیروں سے مسلسل آگاہ کر رہے تھے :

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

کفر و اسلام کا یہ معرکہ سرزمینِ ہند میں کئی محاذوں پر بپا تھا۔ ان میں سے ایک محاذ تعلیم تھا۔ اقبال نے یورپ کی دانش گاہوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ خود بھی کچھ عرصے تک درس و تدریس سے وابستہ رہے تھے۔ اس لیے مغربی تعلیم کے حسن و قبح سے بخوبی آگاہ تھے۔ غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مغربی تعلیم الحاد کے لیے راستہ صاف کرتی ہے اور مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو اسلامی افکار و عقاید سے نہ صرف دور لے جاتی ہے بلکہ بعض حالتوں میں اسلام کے ابطال پر اکساتی ہے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں :

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم! — کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

یہ بات نہ تھی کہ اقبال جوانوں کو ترقی کرتے ہوئے نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جس قسم کی ترقی مغربی نظامِ تعلیم سے حاصل ہوتی تھی، اس کی تان فرنگیوں کی ملازمت پر ٹوٹتی تھی جسے اقبال دوکفِ جو کا حصول قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے مسلمان بچوں کی تعلیم کی غرض و غایت دوکفِ جو کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس قسم کی تعلیم صرف غلام پیدا کر سکتی ہے اور ہندوستان میں انگریزوں کا اوّلین مقصد ایسے ہی غلاموں کی ساخت و پرورش تھا تاکہ ان کے اقتدار کو دوام حاصل ہو۔ یہ دوام دوکفِ جو کے متلاشی ہی دے سکتے تھے۔

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے رو بہ رو — اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دوکفِ جو

دو کفِ جو کی تلاش کرنے والوں کے لیے اقبال کا پیغام واضح تھا:

نری خاک میں ہے اگر شور تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

اقبال اس اہتمام کے خلاف تھے کہ اقتصادی فوائد کے پیشِ نظر مسلمان اپنی ہستی کا چراغ گل کر دے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مسلمان تو کائنات کا مالک ہے:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا — تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

اقبال کو بعض ناقد ماضی پرست یا عینیت پرست کہتے ہیں جو درست نہیں، اسلام زمانۂ ماضی کا مذہب نہیں۔ اسلام ماضی میں تھا، حال میں ہے اور مستقبل میں روزِ حشر تک رہے گا۔ عینیت پرست جو آرزو کرتا ہے وہ کبھی پوری نہیں ہوتی لیکن اقبال نے آج سے چالیس پچاس سال پیشتر جو کچھ کہا وہ حقیقت بن کر آج ہمارے سامنے ہے۔ اقبال کے پیغمبرانہ اشعار آج حقیقت میں ڈھل چکے ہیں۔ جب وہ مسلمان کو ایشیا کا پاسبان کہتا ہے تو وہ اپنی اس پیغمبرانہ حیثیت سے بات کرتا ہے:

جہاں آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

غور کا مقام ہے کہ کہاں دو کفِ جو کا متلاشی اور کہاں اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسبان۔ اقبال ہندی مسلمان کو ایشیا کا پاسبان دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ مغربی تعلیم اسے ایک بنکاری بنا دیتی ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جسے اقبال مطعونِ گردانتا ہے:

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز — ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم!! — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ہمارے انگریز حکمرانوں نے میکالے اور دیگر ماہرینِ تعلیم کے ذریعے جو نظامِ تعلیم ہم پر مسلط کیا اس کا اصل مقصد ہمیں مسلسل غلام رکھنا تھا۔ اقبال انگریزوں کے اس مقصد سے آگاہ تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو اس سازش سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ علامہ نے جہاں کہیں بھی مغربی تعلیم کا لفظ

استعمال کیا ہے، اس سے مراد برصغیر پاک و ہند میں مروج نظامِ تعلیم سے ہے، جو ان بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا کہ یہاں کے نوجوانوں کو بدستور انگریز کی غلامی میں رکھا جائے۔

اک لرڈ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

علامہ اقبال قدم قدم پر مسلم نوجوانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ یہ مغربی تعلیم اسلامی عقاید کو پاش پاش کر کے لادینیت لاتی ہے۔ مردانِ حر کو دو کفِ جو کی گداگری پر مجبور کرتی ہے اور جوانوں کی خودی کو ختم کر دیتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خودی کے خاتمے پر ہوتا کیا ہے؟ علامہ کے نزدیک خودی کے چار مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس، تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی اور چوتھا مرحلہ ملتِ اسلامیہ سے وابستگی اور ارتباط۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر اُو را کمال از ملت است
فرد میگرد ز ملّت احترام — ملّت از افراد می یابد نظام

خودی کا خاتمہ غلامی کی طرف پہلا قدم ہے اور غلامی روح و بدن کی موت کا اعلان اور ملی انتشار کا ثبوت ہے:

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی بزم ملت فرد فرد — این و آں واین و آں اندر نبرد

برصغیر پاک و ہند میں مروجہ نظامِ تعلیم سے جس قسم کے جوان تیار ہوتے ہیں ان کو علامہ اقبالؒ نے "بتانِ عصرِ حاضر" کا نام دیا ہے، لیکن یہ وہ بت ہیں جن کی ادا دل کو گرفت میں نہیں لیتی اور تراش خراش آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتی۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

بت میں روح تو ہوتی نہیں صرف صورت اور پیکر سے کام چلتا ہے اور اگر صورت غمزہ ادا، تراش خراش اور خط و خال بھی دلآویز نہ ہوں تو پیکر تراشی اور بت گری کارِ عبث ہے۔

رہا روح اور آواز کا مسئلہ تو جب خودی نہ ہوگی تو روح اور آواز کہاں سے پیدا ہوگی۔ کیونکہ وہ دانش گاہیں جہاں مغربی تعلیم دی جاتی ہے، روح کا گلا گھونٹ دیتی ہے :

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اقبال ایسے تمام علوم کے خلاف ہیں جن سے مسلمان معاشی طور پر انگریزوں کے دستِ نگر ہوں۔ ان کی خودی خود داری اور ان کی عزت نفس مجروح ہو اور ان ناقابلِ تلافی نقصانات کے باوجود وہ بدصورت اور بد ہیئت کاٹھ کے انسان بن جائیں۔ ان کے خیال میں ایسے علم کے بغیر بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے　　لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

اقبال اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مغربی تعلیم سے عزت بھی مل سکتی ہے اور دنیا کی دوسری آسائشیں بھی میسر آ سکتی ہیں، لیکن اس سے ہمارے جوانوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اسلام کی درخشاں تعلیمات سے دست کش ہو جائیں گے۔

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا　　آئی صدا پاؤ گے تعلیم سے اعجاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل　　دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی　　فطرت جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

علامہ اقبال مسلمان جوانوں کے لیے مغربی تعلیم کے بجائے اسلامی طرزِ تعلیم کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ یہ نسخہ مسلمان طالب علم کے امراض کا کافی و شافی علاج ہے۔ اگر مسلمان طالب علم اس نسخے پر عمل کرے گا تو الحاد، گداگری اور ذات کی نفی کے عوارض سے رستگاری پالے گا۔ اس کا ضمیر پاک ہوگا، نگہ بلند ہوگی اور شوق کی مستی سے اس کا قلب سرشار ہوگا۔ اس کا سینہ آرزو سے آباد ہوگا اور اس قابل ہو جائے گا کہ دنیا کی امامت کر سکے:

مٹائے قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مغربی خرد

مغربی تعلیم کے بعد جلوۂ دانشِ فرنگ کا دوسرا مظہر مغربی خرد ہے۔ اقبال نے یورپ میں

مغربی خرد کے کئی مظاہرے دیکھے اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیا۔ لیکن یہ مظاہرے علامہ کو متاثر نہ کر سکے۔ یہ مظاہرے سطحی جادوگری سے زیادہ نہ تھے:

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی　　مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

جو مسلمان جوان انگریزوں کی عقلی جادوگری سے متاثر ہوا، اقبال اس کو مریض تصور کرتے ہیں، اور اس کا علاج آتشِ رومی کے سوز میں بتاتے ہیں:

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

علامہ اقبال کو احساس ہے کہ فرنگیوں کی فسوں کاری میں گرفتار جوان ان کی بات پر برا مان جائیں گے۔ چنانچہ وہ ان سے کہتے ہیں کہ فرنگی عقل و خرد کو آزما کر دیکھ لو نتیجہ سامنے آجائے گا:

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے　　فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری

علامہ اقبال نے مغربی فکر و خرد کو خود آزما کر دیکھا ہے۔ اس لیے وہ نتیجے سے پوری طرح آگاہ ہیں:

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟　　دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

حکمت مغرب سے ملت کی یہ حالت ہوئی　　ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

زمانۂ حاضر کی فکر و دانش نے جو سحر پھونکا ہے اس کے اثرات سے بچ نکلنا آسان نہیں۔ اقبال نے اس سحر کو سحرِ قدیم کا نام دیا ہے کیونکہ اس سحر کی جڑیں افلاطون کے عہد میں پیوست ہیں۔ وہی افلاطون جس کے بارے میں علامہ نے فرمایا:

راہب اوّل فلاطون حکیم　　از گروہِ گوسفندانِ قدیم

انگریز کے اس سحرِ قدیم سے نجات پانے کے لیے بھی علامہ اقبال کے پاس تیر بہدف نسخہ ہے:

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم　　گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

مغربی خرد بظاہر روشنی لیکن بباطن تاریکی ہے اور اس کے اثرات سماجی طور پر سخت تلخ:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے　　حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

ظاہر ہے یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں ضرور تبدیلی واقع ہوگی اور تبدیلی ایک بہتر صورتِ حال پیدا کرے گی۔

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ سستی بنیاد بھی ہے آئینۂ دیوار بھی ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سُست بنیاد ایوان فرنگ جو اہلِ فرنگ نے عقل و خرد کے سحرِ قدیم سے سجا رکھا ہے تباہ کیوں کر ہوگا؟ اس سوال کا جواب یوں ہوگا کہ اس کی بنیاد سیاسی استحصال پر استوار کی گئی ہے، اس لیے تباہی اس کا مقدر ہے:

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ ایجاد

مغربی عقل و خرد میں وقتی اور ہنگامی چکا چوند تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا دامن گہرائی و گیرائی سے خالی ہتا ہے:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

مغربی عقل و خرد کے کھوکھلاپن سے انسان اور شیطان دونوں آگاہ ہیں۔ یہ بات شیطان کی مجلس ں بیان ہوئی ہے۔ نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں" ابلیس کا یا نچواں مشیر اسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اب اسے اہلِ فرنگ کی فراست پر یقین نہیں رہا۔ یعنی اہلِ فرنگ اپنے مخصوص اندازِ فکر میں شیطان ور اس کے ساتھیوں سے بھی کچھ آگے ہی نکل گئے ہیں:

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام اب مجھے ان کی فراست پر نہیں اعتبار

جس طرح مغربی خرد گمراہ کن اور کھوکھلی ہے، اسی طرح مغربی جنوں بھی مصنوعی اور بے اثر ہے اور س میں اتنی سکت نہیں کہ کوئی گریباں چاک ہو سکے:

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک

اہلِ مغرب کا جنوں اور خرد دونوں مسلمان کے لیے مضر ہیں اور ان سے چھٹکارا بے حد ضروری ہے۔ چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے؟ اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ نوجوان طبقہ اسلامی فکر کی پیروی کرے۔ یہ وہی اسلامی فکر ہے جس کے سوتے سرزمینِ عرب سے پھوٹتے ہیں:

فکر صالح در ادب می بائیدت رجعتے سوئے عرب می بسائیدت

اگر ہمارا نوجوان طبقہ اسلامی فکر اپنا لے گا تو اسے برگساں، اشپنگلر، شوپنہار، رسل اور کانٹ کے افکار و تصورات کا مرہون احسان نہ ہونا پڑے گا۔

مغربی تہذیب و ثقافت

مغربی عقل و خرد کے بعد جلوۂ دانشِ فرنگ کا تیسرا مظہر مغربی تہذیب و ثقافت ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب و ثقافت ہمارے لیے زہر کی طرح مہلک ہے۔ مغربی تہذیب نے نوجوان طبقے کے فہم و ادراک اور طرزِ زندگی کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی ذات کو مٹا چکا ہے اور مغربی نوجوانوں کا روپ اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کی وضع قطع، اس کا لباس، اس کی جذباتی کیفیت، اس کا اندازِ نظر، اس کی موسیقی، اس کی مصوّری، اس کی ادب نوازی، اس کے کھیل، اس کی مذہب سے بیزاری، اس کی طرف سے مشرقی قدروں کی تضحیک، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسلمان ہوتے ہوئے انسان کا یورپی ایڈیشن ہو۔ وہ تہذیبِ مغرب کی تقلید میں فخر محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ یہ نشہ ذہنی بیماری پر دلالت کرتا ہے:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بےباکی

مغربی تہذیب کے والا و شیدا اشیا کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ہیئت پر فدا ہیں۔ انھیں ان اشیا کے باطن کا علم نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی معمولی بات پر مشرق سے ناراض اور مغرب سے خوش ہو جاتے ہیں۔ ان پر اقبال کا طنز بے جا نہیں۔

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے وہاں کنستر سب بلوری ہیں یہاں ایک پرانا مٹکا ہے

ظاہری ٹیپ ٹاپ کی پرستش اور باطن سے بے خبری کا یہی موضوع اس شعر میں ملتا ہے:

نئی تہذیب تکلیف کے سوا کچھ بھی نہیں چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

مغربی تہذیب میں گلگونہ فروش کی رعایت سے مغربی عورت کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو:

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابرکاب

مغربی عورت کے مقابلے میں مسلمان عورت اس لیے بہتر سماجی اور تہذیبی حیثیت کی مالک ہے کہ اسے

لونہ یا غازہ کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ علامہ اقبال مسلمان عورت کو جو مشورہ دیتے ہیں وہ قیمتی بھی ہے اور قابلِ دید بھی۔

بہل اے دخترک دلبری ہا مسلمان را نزیبد کافری ہا
منہ دل بر جمالِ غازہ پرور بیاموز از نگاہ غارت گری ہا

دخترانِ ملت کے لیے علامہ اقبال کا یہ پیغام بھی کچھ کم اہم نہیں۔

ز شام ما بروں آور سحر را بقرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو میدانی کہ سوزِ قرأت تو دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

مغرب کی کھوکھلی تہذیب میں جس چیز کو آزادی کا نام دیا گیا ہے، دراصل وہ غلامی کا دوسرا نام ہے۔ انسانی تہذیب میں اگر کہیں صحیح آزادی میسر ہے تو وہ صرف اسلام میں ملتی ہے:

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر مری دانش ہے افرنگی، مرا ایمان ہے زناری

مغربی تہذیب کے انعامات، شراب، جوا اور زنانِ بازاری کا اندازہ علامہ کی نظم "یورپ اور سوریا" سے لگایا جا سکتا ہے۔

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبی عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اہلِ فرنگ کے قلب و نظر میں فساد اور انتشار ہے اور فرنگی مدنیت کی روح ناپاک ہے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اس فسادِ قلب و نظر کی ایک اور وجہ بھی ہے جسے یکتائی کے فقدان سے تعبیر کیا جائے گا۔ یورپ جغرافیائی قوم پرستی پر یقین رکھتا ہے۔ مختلف قومیں جغرافیہ کے سانچوں میں اسیر ہیں، اس لیے خیر کے لیے کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ان کے لیے مشکل ہے۔ البتہ شر کے لیے وہ آسانی سے یک جا ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں شر کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ نظریاتی اعتبار سے جغرافیہ یا رنگ و نسل کا

امتیاز بھی اسلام میں مفقود ہے۔

بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی روح بیمار ہے اور جو بیماری اُسے لاحق ہے وہ لاعلاج ہے۔ یہ بیماری بے ثباتی، بے یقینی اور بے حضوری کی ہے، فسادِ قلب و نظر نے اس بیماری کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے:

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور   بے ثبات و بے یقین و بے حضور

اس بیمار تہذیبی ماحول میں ہمارے نوجوان طبقے کے جو افراد پلے بڑھے ہیں اور مغربی تہذیب و ثقافت پر جان نثار کرتے ہیں، ان کے لیے علامہ اقبال کا ردِ عمل ڈھکا چھپا نہیں، واضح اور دو ٹوک ہے۔ علامہ اقبال دردِ دل سے مسلمان نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہیں اور خلوصِ دل سے دعا بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے مغربی تہذیب کے بُرے اور مضر اثرات سے بچائے:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی   خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

حکیم فرزانہ

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

اب تک غالب کی شاعری اور شخصیت پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس میں اضافہ کرنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا، مگر شیخ محمد اکرام نے "حکیم فرزانہ" میں غالب کی "دید و دانش" کی جو نو بہ نو پرتیں کھولی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی غالب پر وہ کچھ لکھا ہی نہیں گیا جو لکھا جانا چاہیے تھا، اور شیخ صاحب نے "حکیم فرزانہ" کی صورت میں اس جستجو کا ایسا آغاز کیا ہے جو امکانات سے پُر ہے۔ دراصل ان کے نزدیک جدید تنقید کا معیار یہ ہے کہ وہ شعر و ادب کے مطالعے کو حیاتِ انسانی کی عمیق گہرائیوں کا مطالعہ بنا دے اور حق بات یہ ہے کہ شعرِ غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام نے جدید نقاد کا یہ فریضہ کمال خوبی سے پورا کیا ہے۔

صفحات: ۸ + ۲۰۷   قیمت ۴۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور